سامراجیت وملوکیت پر اقبال کی تنقید: ایک تحقیقی مطالعہ

شیراز زیدی*

ABSTRACT:

Iqbal was born in the rising age of British colonialism. He used to observe all the corrupt policies of this way of rule, especially, towards the conquered countries, since his student life. However, for a keen observation of European culture he visited Europe in 1905 and stayed there till 1908. Within a very short period, i.e. three years, he observed that the European culture itself has a blasting material in its soul, which is dangerous for all human beings. So he came back with a complete plan against every aspect of colonialist way of rule, such as feudalism, capitalism, dictatorship, imperialism and even European made democracy. He devoted all his life to reject and criticize the policies of colonialism and imperialism that could be seen in all his available poetry and prose. A deep study of his education shows that all his philosophies are gathered as a chain of resistance against colonialism. This article presents Iqbal as the worst enemy of colonialism and imperialism of the 20th century in the light of his poetry and prose.

سامراجیت ''سام راج'' سے ماخوذ ہے جو ہندی زبان کا لفظ ہے اور شہنشاہی نظامِ حکومت، نو آبادیات اور ماتحت سلطنتیں رکھنے کی منصوبہ بندی کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ ''قاموسِ مترادفات'' میں ''استعمار''، ''نوآبادیاتی نظامِ حکومت'' اور ''شہنشاہیت'' اس کے مترادفات کے طور پر دیے گئے ہیں (۱)۔ انگریزی میں ''سامراجیت'' کے لیے "Imperialism" اور "colonialism" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ آکسفرڈ ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری کے مطابق:

> "The policy of extending a country's power and influence in the world through political relation or military forces."(۲)

سید عظیم ''سامراجیت'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یوں تو انگریزی زبان میں امپیریل ازم کی اصطلاح ۱۹۴۸ء میں استعمال ہوئی جب نپولین سوم کے زمانے میں فرانس نے فتوحات کیں۔ اردو میں یہ لفظ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکا کی ننگی جارحانہ پالیسیوں کے خلاف استعمال ہوا۔ اس لیے ''امپیریل ازم'' کو اردو میں ''سام راج''، یعنی ''سامن راج''، یعنی ''انکل سام (امریکا) کا راج'' کہتے ہیں۔ آج کل بہر حال یہ لفظ ہر غیر ملکی تسلّط کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی بھی خطے

* ڈاکٹر، اسسٹنٹ پروفیسر، وفاقی جامعہ اردو برائے فنون وعلوم برقی پتا: dr.shirazzaidi@gmail.com
تاریخِ موصولہ: ۱۹رفروری ۲۰۱۴ء

کے مظلوم عوام کو محکوم بنانے کے لیے ہو۔''(۳)

مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ''سامراجیت'' وہ تدبیر یا عمل ہے جس کے ذریعے سے ایک ملک دوسرے ملک یا علاقے پر اپنا تسلُّط قائم کرتا ہے۔اس قسم کی برتری فوجی طاقت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے تاکہ معاشی اور سیاسی فوائد حاصل کیے جاسکیں۔ اس قسم کی وسعت حاصل کرنے والی حکومتیں جو سمندر پار علاقوں پر قبضہ کرتی ہیں، ان کے طرزِ حکومت کو "Colon ialis m" یا ''نوآبادیاتی'' نظامِ کہا جاتا ہے۔اس قسم کا تسلُّط حاصل کرنے والی حکومتیں اپنی برآمدات کے لیے نئے ذرائع، سستے محنت کش اور کم قیمت خام مال بھی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ دور دراز ملکوں کی حکومتیں فوجی برتری اور دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار کیے جانے کے لیے بھی کم زور ملکوں پر قبضہ کرتی ہیں۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے عروج وزوال (مثلاً ایران، روم، برطانیہ، نازی جرمنی) تاریخ کے صفحات میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔''نوآبادیات'' اکثر جنگوں کا سبب بنتی ہے۔(۴)

روم اور بازنطینی سلطنتوں میں سامراجیت کو عروج حاصل تھا۔مغرب میں جدید قومی ریاستیں اور نئی دریافتیں اور ایجادات ''سامراجیت'' کا باعث بنیں۔یورپی دنیامیں عالمی جنگیں خام مال کے سستے حصول اور تجارتی منڈیوں کی تلاش میں یورپی ممالک کے ایک دوسرے پر سبقت حاص کرنے کی کوششوں سے واقع ہوئیں۔''کشافِ تنقیدی اصطلاحاتِ سیاسیات''میں درج ہے:''یورپی اقوام نے اپنے آپ کو اعلیٰ وارفع قرار دے کر پسماندہ اقوام کو زیر کرلیا۔ہسپانویوں اور پرتگالیوں نے تجارتی سلطنتیں قائم کیں لیکن ان تمام اقوام کی سامراجیت پر تجارت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔''(۵)

دوسرے لفظوں میں ''سامراجیت'' دراصل سرمایہ دارانہ نظام کا عروج ہے۔ جب ملک کی باگ ڈور مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آتی ہے تو ان کا مقصد رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا نہیں ہوتا بلکہ زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول ہوتا ہے۔اس وجہ سے سرمایہ کم سے کم افراد کے ہاتھوں تک محدود ہوجاتا ہے اور یہ بڑے بڑے سرمایہ دار بڑے بڑے کارخانوں اور مشینوں کے بل بوتے پر اپنی پیداوار کو بڑھا کر اجارہ داریاں (i) قائم کرلیتے ہیں اور یوں باہمی مقابلہ ختم کر کے اپنا مال من چاہی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں۔اس طرح سرمایہ داروں کو دُگنا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ایک تو یہ کہ اپنا مال بہت مہنگا فروخت کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ مشینوں پر کام کی وجہ سے مزدوروں کی کم تعداد درکار ہوتی ہے،اس لیے مزدوروں کی اکثریت بے روزگار ہوجاتی ہے اور مزدور بے روزگاری کے خوف سے بہت کم اجرت پر زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

آخر کار ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ مال بیچنے کے لیے ملکی منڈیاں کم پڑ جاتی ہیں اور پھر یہ سامراجی گروہ اپنا مال فروخت کرنے کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ چنانچہ سستا خام مال خریدنے اور مہنگی چیزیں فروخت کرنے کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش میں ان کی لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں اور بقولِ اقبالؔ دنیا ''جنگِ زرگری'' کی لپیٹ میں آجاتی

ہے۔نئی منڈیوں کے حصول کے لیے نو آبادیات قائم کرنا، ممالک پر زبردستی قبضہ کرنا، قوموں کو غلام بنانا اور اس طرح ان کی معیشت و معاشرت پر اثر انداز ہونا سامراجی حکومت کا طُرّہ امتیاز ہوتا ہے۔لینن نے سامراجی حکومتوں کے پانچ بڑے خواص بیان کیے ہیں۔اوّل: پیداوار اور سرمایہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے نئی اجارہ داریاں قائم ہوتی ہیں، جو قوموں کی معاشی زندگی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔دوم: بینک کا سرمایہ صنعتی سرمائے میں ضم ہو کر مالیاتی سرمائے کو جنم دیتا ہے۔سِوُم: سرمائے کی برآمد جو جنس کی برآمد سے مختلف ہے اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔چہارُم: سرمایہ داروں کے عالمی گروہ پیدا ہوتے ہیں جو آپس میں دنیا کا بٹوارہ کر لیتے ہیں۔پنجم: بڑی بڑی سرمایہ دار طاقتوں کے درمیان دنیا کے خِطّوں کی تقسیم مکمل ہو جاتی ہے(۶)۔

سامراجی حکومتیں اپنے تجارتی مقاصد کے تحت دوسرے ملکوں پر زبردستی قبضہ جما لیتی ہیں تاکہ منڈیوں میں اپنی اجارہ داری بلا روک ٹوک قائم کر سکیں۔سرمایہ دار ممالک اپنی نو آبادیات سے خام مال انتہائی سستی قیمتوں پر حاصل کرتے ہیں اور بسا اوقات مفت ہی چھین لیتے ہیں۔جب کہ اپنی مصنوعات انتہائی مہنگے داموں فروخت کرتے ہیں۔ایسی ہی منڈیوں کے حصول کے لیے ان سامراجیوں کی آپس کی لڑائیاں دنیا میں تباہ کن جنگوں کا باعث بنی ہیں، جن کی وجہ سے انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح سرمایہ داروں کی ہوسِ زر کی بھینٹ چڑھے۔شیر جنگ کے الفاظ میں:

> ''زمانہ قدیم سے یورپی ملکوں کا یہ دستور رہا ہے کہ اپنی نو آبادیات میں اور پسماندہ ملکوں میں اپنی علمی اور مہمل قسم کی لیکن بھڑک والی مصنوعات کو سونے اور چاندی کے بھاؤ بیچ کر وہاں کی بیش بہا چیزوں کو اونے پونے داموں پر اور بسا اوقات زبردستی ہتھیا کر مفت ہی حاصل کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔رفتہ رفتہ طاقت ور ملکوں نے غیر ملکی بڑے بڑے علاقوں پر اور وہاں کی آبادی پر اپنا دخل جمانا شروع کیا اور ان کے حاکم بن بیٹھے۔برطانیہ کی یہ ڈینگ کہ 'اس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا' اس کی لٹیری حرکتوں اور تباہ کاریوں کی وسعت کا پتا دیتی ہے۔''(۷)

ہندوستان میں سامراجی نظام ایسٹ انڈیا کمپنی کی یلغار سے قائم ہوا۔سنہ ۱۶۰۰ء میں انگریز تاجروں کے روپ میں داخل ہوئے۔اس وقت مغل سلطنت کے پاؤں ہندوستان میں جم چکے تھے۔۱۶۱۲ء میں جہاں گیر کی اجازت سے کمپنی نے سورت، احمد آباد اور بمبئی میں چند کارخانے بنائے اور مدراس کے راجا سے اجازت لے کر مدراس میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام ''سینٹ جارج'' رکھا(۸)۔انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں تیزی سے تعمیر کر لیں اور مال کی حفاظت کے بہانے فوج رکھنی شروع کر دی۔آہستہ آہستہ برِصغیر کی سیاست و معاشرت اور معیشت میں ان کا عمل دخل اور اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔یہاں تک کہ عالم گیر کے دور میں مغل سلطنت عروج کے بعد زوال کی طرف گام زن ہونے لگی۔عالم گیر کے نا اہل جانشینوں کی وجہ سے ملک رفتہ رفتہ سامراجی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوتا چلا گیا۔

اٹھارہویں صدی میں انگریز تاجروں نے ملکیتِ زمین حاصل کر کے بادشاہ فرخ سیَر کے باپ شہزادہ عظیم الشان ابنِ عالم گیر سے، جو کہ ان دنوں بنگال کا صوبے دار اور روپے کا ضرورت مند تھا کلکتہ اور اسکے مضافات میں زمین خرید لی اور ہندوستان کے سب سے زیادہ خوش حال حصے پر تسلُّط حاصل کرلیا(۹)۔ واضح رہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے تمام اخراجات بنگال کے محاصل سے چلتے تھے۔ بنگال پر قبضے سے ہندوستان کی اقتصادی شہ رگ انگریزوں کے قبضے میں آگئی (۱۰)۔۱۷۱۵ء میں کمپنی کے تاجروں نے اپنا ایک ایلچی تحفے دے کر فرُّ خ سیَر بادشاہ دہلی کے دربار میں بھیجا جس کے ساتھ ایک ماہر ڈاکٹر ہملٹن بھی تھا۔فرُّ خ سیَر ان دنوں ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا جس نے ہندوستان کے حکیموں کو ناچار کر دیا تھا۔اس بیماری کی وجہ سے بادشاہ کی شادی جو کہ راجا جودھ پور کی لڑکی سے طے ہوئی تھی ،ملتوی ہوگئی تھی۔ہملٹن نے بادشاہ کا علاج کیا اور اس کے انعام میں کمپنی کے تاجروں کی اجناس کا محصول معاف کرالیا اور حفاظتی غرض سے قلعے تعمیر کرانے اور فوج رکھنے کی اجازت حاصل کرلی۔چنانچہ انگریزوں نے فورٹ ولیم قلعہ تعمیر کیا اور اپنی زمین داری کو وسعت دی (۱۱)۔۱۷۵۷ء ہی سے انگریز اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ انھوں نے جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کوشکست دی، ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کی اینٹ سے اینٹ بجائی، ۱۷۶۴ء کی بکسر کی جنگ میں میر قاسم، شجاع الدولہ والئ اودھ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو منتشر کر دیا اور یوں بنگال پر مکمل تسلُّط حاصل کرلیا۔ بنگال ہی سے انھیں ایسے ذرائع میسر آئے جن کے زور پر ہندوستان کو کسی بھی وقت تسخیر کیا جا سکتا تھا۔(۱۲)

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے واقعات بتاتے ہیں کہ ہندوستان مکمل طور پر برطانوی سام راج کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ انگریزوں کے مغربی حریف پرتگالی، ولندیزی اور فرانسیسی شکست سے دوچار ہوکر ان کے لیے ہندوستان کا تجارتی میدان خالی کر چکے تھے اور مغل سلطنت کی مرکزیت کے خاتمے نے انگریزوں کے لیے سنہری مواقع فراہم کر دیے تھے۔تاہم سلطان حیدرعلی اور ٹیپو سلطان جیسے لوگ آزادی کے لیے میدان میں اترے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ حصولِ آزادی کے لیے آخری مزاحمت ثابت ہوئی اور اس کے ناکام ہونے کے بعد ہندوستان عسکری، تہذیبی، معاشی اور معاشرتی طور پر بھی انگریزوں کے سامنے سرنگوں ہوگیا۔

انگریز تاجروں کے روپ میں ہندوستان میں داخل ہوئے اور اپنی مکاریوں اور چال بازیوں سے اس سرزمین کے مالک ومختار بن گئے۔ان کا حکومت کرنے کا انداز غوری اور مغل فاتحوں کی طرح نہیں تھا جنھوں نے اس ملک کو فتح کرنے کے بعد اپنا ملک بنالیا تھا اور یہاں کی تہذیب ومعاشرت کو ملیامیٹ کرنے کے بجائے آپس کے میل جول سے ایک نیا مشترکہ رنگ عطا کیا تھا۔انھوں نے زندگی جتنے بھی عیش وآرام میں گزاری ہو، وہ نہ تو ہندوستان کی دولت کو ملک سے باہر لے کر گئے اور نہ رعایا کا استحصال کیا۔ جب کہ انگریزوں کو اس ملک کی تہذیب وثقافت سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ان کے لیے اگر کوئی کشش تھی تو وہ یہاں کی بے پناہ دولت، معدنیات کے ذخائر، سستے مزدور اور اپنی اشیا کے فروخت کے لیے ایک

عظیم الشان منڈی تھی۔ چناں چہ انھوں نے اس کے حصول کے لیے فتنہ پردازیوں اور جبر وتشدّد کی حکومت کو وطیرہ بنایا جس کا تجربہ وہ آئر لینڈ پر قبضے کے بعد کر چکے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے مذہبی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی قوموں کو عیسائی بنالیا جائے تو وہ آزادی کے لیے جدو جہد نہیں کریں گے بلکہ برطانوی حکومت کے وفادار ہو کر رہیں گے۔

اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ انگریز سامراجیت کے عروج کا دور تھا۔ ہندوستان کی معاشرت ومعیشت تباہ ہو رہی تھی۔ایک طرف انگریز تاجر ہندوستان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے تو دوسری طرف انگریزی تہذیب وثقافت ہندوستان کے عوام کو سبز باغ دکھا رہی تھی۔اقبال اپنی طالب علمی کے دور سے ان تمام حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اس تہذیب و معاشرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں جو اپنے علم وفن کا پرچار اس شدّت سے کر رہی تھی۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان کے لیے رختِ سفر باندھا مگر یورپ میں مختصر قیام کے دوران ہی انھوں نے یہ اندازہ لگالیا کہ مغربی تہذیب ،جس کی بنیاد مادیت اور سرمایہ داری پر ہے،خود اپنے دامن میں اپنی تباہی کے لامحدود امکانات رکھتی ہے، کیوں کہ سرمایہ دار ممالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے تیزی سے تیاریوں میں مصروف ہیں اور سرمایہ داری کا یہ روز افزوں سیلاب سامراجی قوتوں کو نئی منڈیاں قائم کرنے کے لیے پسماندہ ملکوں پر قبضے کی تحریک دے رہا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اس آنے والی تباہی کی پیش گوئی کر دی تھی جو آخر کار دو تباہ کن جنگوں کی صورت میں سامنے آئی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا (۱۳)

چناں چہ جب اقبال وطن لوٹے تو نہ صرف یہ کہ وہ مغرب کے اس انسانیت سوز طوفان سے پوری طرح باخبر ہو چکے تھے بلکہ ہندوستان کو مغربی سامراج کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے ایک واضح منشور بھی ترتیب دے چکے تھے اور اس بات کا اعلان انھوں نے اپنی ایک نظم ’’عبدالقادر کے نام‘‘ (ii) اور مارچ ۱۹۰۷ء والی نظم (iii) مشمولہ ’’بانگِ درا‘‘ میں واضح طور پر کر دیا تھا۔اسی لیے انھوں نے اپنی شعری ونثری صلاحیتوں کو برِصغیر کی قوموں کو سامراج کے خلاف ذہنی وجسمانی طور پر لیس کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔اقبال سامراجیت کے مذموم عزائم سے پوری طرح باخبر ہو چکے تھے۔انھوں نے برِصغیر کی قوموں کو خبر دار کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ تہذیب کے پروردہ ان سامراجی اونٹوں کو جن کے پیٹ ہندوستان کے سونے چاندی سے پھٹے جا رہے تھے، ہندوستان سے بھگانے کا مشورہ دیا:

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر — فتنہ ہا در آستینِ اُو نگر
از فریبِ اُو اگر خواہی اماں — اشترانش را زحوضِ خود براں
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد — وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد (۱۴)

ترجمہ:

۱۔ تو جو فرنگی کے سحر سے بے خبر ہے اس کی آستیں دیکھ کہ اس میں ہزاروں فتنے چھپے ہوئے ہیں۔

۲۔ اگر تو اس کے فریب سے امان چاہتا ہے تو اس کے اونٹوں کو اپنے حوض سے نکال دے۔

۳۔ اس کی چالوں نے ہر قوم کو بے بس کر کے رکھ دیا ہے اور عربوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

انگریزوں کی حکومت اصل میں سوداگروں کی ملوکیت تھی۔ وہ ایک طرف تجارت سے منافع حاصل کر رہے تھے اور دوسری طرف بادشاہت کی بدولت عوام سے محصول حاصل کر کے اپنے خزانے بھر رہے تھے۔ اپنی ہوسِ زر کو مٹانے کے لیے انھوں نے ہر قسم کا ظلم روا رکھا۔ انھوں نے ہندوستان کی قوموں کا تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی استحصال بھی کیا اور معاشی طور پر بھی انھیں تباہ حال کر دیا۔ وہ ہندوستان سے حاصل کیے ہوئے خام مال سے چیزیں بنا کر یہاں کے عوام کو مہنگے داموں فروخت کرتے۔ اقبال نے مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں انگریز سامراج کی ریشہ دوانیوں اور لوٹ کھسوٹ پر جو تنقید کی ہے اس سے سام راجی نظام سے ان کی شدید نفرت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

آدمیت زار نالید از فرنگ — زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
گُرگے اندر پوستینِ برّہ ء — ہر زماں اندر کمینِ برّہ ء
در نگاہش آدمی آب و گِل است — کاروانِ زندگی بے منزل است
شرعِ یورپ بے نزاعِ قیل و قال — برّہ را کرد است بر گُرگاں حلال
خود بہ دانی بادشاہی قاہری است — قاہری در عصرِ ما سوداگری است
آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است — بر زبانش خیر و اندر دل شر است
کشتنِ بے حرب وضرب آئینِ اوست — مرگ ہا در گردشِ ماشینِ اوست
گوہرش تُف دار و در لعلش رگ است — مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است
تاجرانِ رنگ و بُو بر دند سود — ما خریداراں ہمہ کور و کبود
قالی از ابریشمِ تو ساختند — باز اورا پیشِ تو انداختند (۱۵)

ترجمہ:

۱۔ فرنگ کے ہاتھوں آدمیت بہت ہی نالاں اور جوش و جذبے سے عاری ہو چکی ہے۔

۲۔ وہ بھیڑ کی کھال میں ایک ایسا بھیڑیا ہے جو ہر لمحے بھیڑ کی گھات میں لگا ہوا ہے۔

۳۔ اس کی نگاہوں میں انسان محض ایک مٹی کا پتلا ہے اور زندگی کا قافلہ بے منزل چلا جا رہا ہے۔

۴۔ یورپ کی شرع نے کسی مقدمے اور دلیل کے بغیر بھیڑ کو بھیڑیوں کے لیے حلال کر دیا ہے۔

۵۔ تجھے معلوم ہے کہ بادشاہی قاہری ہے اور ہمارے زمانے میں قاہری نے سوداگری کا روپ دھار لیا ہے۔

۶۔ وہ حکمران جو سوداگر بھی ہے اس کی باتوں میں خیر ہے لیکن دل شر سے بھرا ہوا ہے۔

۷۔ بغیر جنگ کیے اور تلوار چلائے مار ڈالنا اس کا دستور ہے اور اس کی مشینوں کی گردش میں موت چھپی ہے۔

۸۔ اس کا موتی تھوک سے بنا ہے اور اس کے لعل میں نقص ہے اور اس سوداگر کی مشک ہرن کی بجائے کتے کی ناف سے حاصل کی گئی ہے۔

۹۔ رنگ وبو کے یہ سوداگر نفع کما کر لے گئے اور ہم خریدار بنے رہ گئے۔

۱۰۔ انھوں نے قالین تیری ریشم سے بنایا اور پھر تیرے ہی سامنے لا کر ڈال دیا یعنی تجھے ہی فروخت کر دیا۔

ہندوستان میں انگریز سامراج کے تسلُّط نے ہندوستان کی قوموں کو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ان میں غلامی کا احساس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ وہ یورپ کے ہر اچھے برے کو بغیر کوئی تمیز کیے اخلاق کا معیار سمجھنے لگے تھے۔ جب کہ سامراجی حکومت نے انھیں بے کاری، عریانی، مے خواری اور افلاس کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ مغربی تہذیب سرمایہ داری اور مادیت پر استوار تھی۔ اس لیے اس میں مذہب کے لیے بھی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔ کیوں کہ مذہب غیر مادی ہے جس کا تعلق خالص انسانی جذبات واحساسات سے ہے۔ (اسلام اور دیگر آسمانی مذاہب عیسائیت، یہودیت کی ماہیت کیا ہے؟ یہ ایک الگ موضوع ہے اس میں روح، عقل، مادہ اور وحی ربانی ہر ایک کا اپنا مقام ہے۔ مدیر) روحانیت کے انکار نے اس تہذیب کو الحاد کی جانب گام زن کر دیا تھا، جس میں مذہب کے مقابلے میں سرمایہ داری اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ لہٰذا عبادت گاہوں کے بجائے بنکوں کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہونے لگیں۔ مشینوں کے استعمال کے ساتھ انسان بھی مشین بن گیا اور محبت ومروت کے جذبات ختم ہوتے چلے گئے۔ سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہونے لگا، عوام پستے چلے جا رہے تھے، اس کے باوجود سامراجی حکومت اپنے علم وحکمت کو مساوات کا علم بردار قرار دے رہی تھی۔ اقبال نے ''بالِ جبریل'' کی ایک نظم ''لینن (خدا کے حضور میں)'' میں سامراج پر جو تنقید کی ہے، اسے آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال کی بصیرت کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ سامراج نے دنیا پر جو اثرات مرتب کیے ہیں، ان میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نظم سے درج ذیل اشعار دیکھیے:

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیٔ تعمیر میں، رونق میں، صفا میں — گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے — سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت — پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس — کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات (۱۶)

اقبال کے نزدیک سامراجیت اور ملوکیت وآمریت ایک ہی نظام کے مختلف روپ ہیں۔سامراجیت (Imperialism) دراصل ملوکیت و آمریت (Dictatorship) ہی کے رحم سے پیدا ہوتی ہے۔اسی لیے سامراجیت، ملوکیت وآمریت کی تمام خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سامراج برطانوی بادشاہت ہی کے روپ میں ظاہر ہوا تھا۔اقبال سامراجیت کی جڑیں اکھاڑنے کے خواہش مند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ملوکیت کو از روئے اسلام حرام قرار دیا ہے۔ملوک یعنی بادشاہ نہ صرف یہ کہ دھوکے اور فریب سے لوگوں پر حکومت کر کے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی طاقت و دولت کے زور پر انھیں غلامی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔اقبال نے ملوکیت کی غلامی سے اس فقر کی غلامی کو پسند کیا ہے جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے:

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دینش ملوکیت حرام است (۱۷)

ترجمہ: میں دنیا کو پناہ دینے والے اس فقر کا غلام ہوں جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے۔

ملوک اور آمر، اپنی طاقت و دولت سے، ہم درد اور دوست خریدتے ہیں، عوام کا خون چوس کر اپنی عیاشیوں کے سامان پیدا کرتے ہیں۔اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ملوکیت پر تنقید کرتے ہوئے اسے ایک ایسی شہد کی مکھی قرار دیا ہے جو پھول سے رس نچوڑ کر لے جاتی ہے اور اگر چہ پھول کی ظاہری شکل وصورت برقرار رہتی ہے مگر اس کی مٹھاس ختم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کے دور اور پھر سامراجی اثرات کے تحت وطنِ عزیز میں حکمرانوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے تو سامراجیت، بادشاہت، آمریت اور جمہوریت کی سرحدیں باہم ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔آزادی کے بعد کوئی بھی دور رہا ہو سامراجیت کے جملہ خواص حکمران طبقے کے فکر وعمل میں نمایاں رہے ہیں۔انھوں نے بادشاہوں کی طرح زندگی بسر کی ہے، ہر دور میں جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں نے برسرِ اقتدار آکر سامراجیت کی پیروی میں، اپنے ذاتی مفادات کی خاطر عوام کے حقوق کو پامال کیا ہے۔عوام ایک طرف معاش کی چکی میں پستے رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی دولت لوٹ کر غیر ممالک کے بینکوں میں بھی منتقل کی جاتی رہی ہے۔غرض کہ چند خاندان پھلتے پھولتے رہے ہیں اور عوام زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم زندگی گزارنے پر مجبور رہے ہیں۔اقبال نے ملوکیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہی اب تک ہماری جمہوریت پر بھی صادق آتا رہا ہے، کیوں کہ جمہوریت کے جس طرز کو ہم نے اپنایا ہے، وہ بھی سامراجیت اور ملوکیت ہی کے بطن سے پیدا شدہ ہے۔آگے بڑھنے سے پہلے ملوکیت سے متعلق یہ اشعار بھی دیکھتے چلیے:

ہم ملوکیت بدن را فربہی است　　سینۂ بے نورِ اُو از دل تہی است
مثلِ زنبورے کہ بر گُل می چرد　　برگ را بگذار و شہدش می برد(۱۸)

ترجمہ:

۱۔ ملوکیت بھی بدن کو موٹا کرتی ہے اور اس کا بے نور سینہ دل سے خالی ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی مثال شہد کی مکھی کی سی ہے جو پھول کو چرتی ہے، پتوں کو چھوڑ دیتی ہے اور اس کا شہد لے جاتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ ملوک صرف اپنی عیاشیوں کا سامان پیدا کرتا ہے، خود پھلتا پھولتا ہے، اپنے پیٹ پر نظر رکھتا ہے اور عوام کے لیے اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہوتا، یعنی کٹھور اور پتھر ہوتا ہے، ان کے دکھوں تکلیفوں سے بے نیاز ہوتا ہے، جیسے شہد کی مکھی پھولوں کا رس نچوڑ کر لے جاتی ہے، اسی طرح یہ بھی ملک وقوم کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے اور عوام کے لیے صرف مسائل چھوڑ دیتا ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ اٹلی کے فاشسٹ مسولینی سے متعلق اقبال کی نظم سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ مسولینی کی فاشسیت کے حق میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے کہیں اس کی حمایت نہیں کی۔ اگر مسولینی سے متعلق اقبال کی نظم کے مصرعوں کو غور سے پڑھا جائے تو یہ مسولینی کی حمایت میں نہیں بلکہ مسولینی کی زبان سے مغربی استعمار کی مذمت اور خود مسولینی کا اعتراف جرم ہے۔ مسولینی نے مغربی استعمار کو آئینہ دکھایا ہے کہ جس فاشسیت پر آج وہ ماتم کر رہا ہے اس کا راستہ ان ہی کا دکھایا ہوا ہے۔ اس غزل کا آخری شعر مسولینی کی فاشسیت سے متعلق اقبال کے مسلک کا کھل کر اظہار کر رہا ہے:

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کُشی　　کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج (۱۹)

مسولینی کی فاشسیت کو اقبال نے غارت گری اور آدم کُشی کہا ہے، بلکہ خود مسولینی کی زبان سے کہلوایا ہے۔ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی مسولینی نے ابی سینیا پر حملہ کر رکھا تھا۔ اس صورت میں اقبال جیسا شخص مسولینی کی حمایت کر بھی کیسے سکتا تھا؟ اقبال نے تو ان مسلمانوں کو بھی ہدفِ ملامت بنایا ہے جنھوں نے اسلامی تعلیمات کے برعکس ملوکانہ طرز حکومت کا چلن اختیار کیا:

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت　　دین اُو نقش ازملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر　　عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر(۲۰)

ترجمہ:

۱۔قرآن کی منزلِ مقصود اور ہے جب کہ مسلمان کی منزل اور آئین اور ہے۔

۲۔اس نے خود قیصر و کسریٰ کو شکست دی اور پھر خود ہی تختِ ملوکیت پر بیٹھ گیا۔

۳۔جیسے جیسے مسلمانوں کی سلطنت کا درخت مضبوط ہوتا گیا ان کے دین نے ملوکیت کی روش اختیار کر لی۔ملوکیت سے نگاہ کچھ اور ہو جاتی ہے، عقل و ہوش اور رسم وراہ اور ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی سلطنت کی توسیع کے لیے ملک گیری پر اقبال سے زیادہ بے باک رائے شاید ہی کسی مسلم مُفکّر نے دی ہو۔ اگر چہ مسلمان جہاں بھی گئے عام طور پر انھوں نے توحید کا پیغام پہنچا کر معاشی و قومی مساوات کا درس دیا، نہ کہ سامراجیوں کی طرح نسلی و قومی تعصب پیدا کر کے لڑ اور حکومت کرو کی روش اختیار کی، لیکن سامراجی عزائم نہ رکھنے کے باوجود یہ فتوحات اقبال کے نزدیک اسلام کا ہدف نہیں تھیں بلکہ اسلام کے اصل مقاصد کے لیے نقصان دہ تھیں۔''اسرارِ خودی'' کے مترجم، ڈاکٹر نکلسن کے نام ایک مکتوب نے مسلمانوں کی کشور کشائیوں کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے صاف صاف لکھا ہے کہ:

> ''مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔انھوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں، لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداً اسلام کے حقیقی مقاصد میں داخل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی، میرے نزدیک وہ اسلام کے مقاصد کے حق میں بے حد نقصان دہ تھی۔اس طرح وہ جمہوری اور اقتصادی اصول نشو ونما نہ پا سکے جن کا ذکر قرآنِ کریم اور احادیثِ نبوی ﷺ میں جا بجا آیا ہے۔ بے شک مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت تو قائم کر لی، لیکن ساتھ ہی ان کے نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔'' (۲۱)

یہاں اس نکتے کی وضاحت بھی ناگزیر ہے کہ اقبال کے کچھ مفسرین نے انھیں سید جمال الدین افغانی کی پین اسلام اِزم کا مبلغ قرار دیا ہے اور اس سے مراد جغرافیائی سرحدوں کی تفریق ختم کر کے ایک واحد اسلامی سلطنت کا قیام مراد لیا ہے۔اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے عالمی اتحاد سے مراد ایسا سیاسی اتحاد نہیں ہے جس میں سرحدوں کی تفریق ختم ہو جائے، بلکہ اس اتحاد کی بنا مادیت کے برعکس روحانیت پر ہے۔ تقسیم سے پہلے پنجاب کے ایک معروف سیاست دان سر فضل حسین نے اپنی ایک تقریر میں سیاسی پین اسلامزم کے ماضی اور حال میں وجود کی نفی کی تو اقبال نے ان کے موقف کی تائید کی اور واضح کیا کہ سید جمال الدین افغانی نے بھی کبھی ملت کے ایک سیاسی اتحاد کا خواب نہیں دیکھا تھا (۲۲)۔ پین اسلامزم سے بھی دراصل اقبال کی مراد سامراجی عناصر سے پاک نظامِ سلطنت ہے۔فرماتے ہیں:

''پین اسلامزم سے اسلام کی عالم گیر سلطنت بہت مختلف ہے۔اسلام ایک عالم گیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے، جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان پادشاہوں اور سرمایا داریوں کی گنجائش نہیں ہوگی۔دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کردے گا۔غیر مسلموں کی نگاہ میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔'' (۲۳)

اب رہی مغربی جمہوریت تو جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اقبال کی نظر میں وہ ملوکیت ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔اگر کبھی غلاموں میں سمجھ کے آثار پیدا ہو جائیں اور حکومت میں اپنی ترجمانی کا احساس بے دار ہونے لگے تو عیار حکمران انھیں خوش کرنے کے لیے ایک آئین ساز مجلس قائم کر دیتے ہیں لیکن ایسے اصولوں پر کہ صرف جاگیردار، وڈیرے اور سرمایہ دار ہی برسرِ اقتدار آسکیں۔علامہ کی نگاہ میں ایسی جمہوریت سامراجی طاقتوں کا ایسا بہروپ ہے جو اپنے باطن میں ملوکیت سے زیادہ خطرناک ہے، کیوں کہ ملوکیت کا یہ بھیس ابلیس نے اپنے سامراجی گماشتوں کو عوام کو فریب دینے کے لیے عطا کیا ہے۔اقبال کی دو نظموں ''خضرِ راہ'' اور ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' سے بالترتیب درج ذیل اشعار دیکھیے:

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (۲۴)

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خودنگر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (۲۵)

اس مغربی جمہوریت کے مقابلے میں اقبال اسلامی جمہوریت کی راہ دکھاتے ہیں۔البتہ اس مقام پر ٹھہر کر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اقبال کے نزدیک اسلامی جمہوریت سے مراد مُلّائیت ہے۔اقبال یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ دین اور سیاست میں جدائی نہیں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست میں علماء حکمرانی کا کوئی خداداد حق رکھتے ہیں۔اس کا مطلب محض یہ ہے کہ سیاسی نظریے کو چند اخلاقی اصولوں کے ماتحت ہونا چاہیے ورنہ اخلاق اور روحانیت سے عاری سیاست سامراجیت کا روپ دھار لیتی ہے جسے وہ چنگیزیت بھی کہتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون ''خلافتِ اسلامیہ'' میں واضح کر دیا کہ اسلامی جمہوریہ کی بنا ایک آزاد اور مطلق مساوات پر ہے، جس میں کوئی گروہ، کوئی ملک، کوئی زمین، افضل وممتاز نہیں ہے۔اسلام میں کسی مذہبی پیشوائی یا مشیخت کی گنجائش نہیں ہے (۲۶)۔اقبال کس قسم کی جمہوریت کو اسلامی کہتے ہیں اس کی طویل بحث سے بچنے کے لیے اسی مضمون ''خلافتِ اسلامیہ'' سے درج ذیل اقتباس دیکھ لیجیے جو تمام مخلوقات میں افضل واعلا مقام کے حامل رسولِ کریم ﷺ کے ارشاد مبارک پر مبنی ہے۔ایک مرتبہ آپؐ منبر پر تشریف لائے اور

مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے مسلمانو! اگر میں نے کبھی تم میں سے کسی کو اپنے ہاتھ سے مارا ہو تو یہ لو، میرا بدن آج تمہارے سامنے موجود ہے تم مجھے پیٹ لو، اگر تم میں سے کسی کو میرے ہاتھ سے کوئی نقصان یا ضرر پہنچا ہو تو تم اس نقصان کے بدلے آج مجھے نقصان پہنچا لو، اگر میرے ذمے کسی کا مال بطورِ قرض یا بطورِ امانت ہو تو آج میری تمام پونجی تمہارے سامنے حاضر ہے، ہر شخص کو اختیار ہے جو کچھ مجھ سے لینا ہے وہ لے لے۔'' (۲۷)

یعنی اقبال کے نزدیک اسلام کی قائم کردہ جمہوریت وہ ہے جس میں حاکم عوام کے سامنے جواب دہ ہو اور اپنے آپ کو ہر فرد کے سامنے احتساب کے لیے پیش کرنے پر تیار ہو۔ایسی جمہوریت میں نہ تو کسی فرد کو عوام کا استحصال کرنے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی مخصوص ٹولے کو یہ رعایت ملتی ہے کہ وہ انسانیت کو اپنی ہوسِ زر کی بھینٹ چڑھادے۔ایسی سچی جمہوریت غلامی میں مبتلا کرنے کی بجائے حریت کا درس دیتی ہے۔وہ ایسی ہی جمہوریت کے خواہش مند تھے۔اب اسے خواہ کوئی بھی نام دے دیا جائے۔ یہاں اس بات کی بھی نفی خود بہ خود ہو جاتی ہے کہ اقبال ملحد اشتراکیت کے حامی تھے۔سرمایہ داری پر تنقید اور عوام اور مزدوروں کی ہم دردی میں ان کی جتنی بھی نظمیں اور اشعار ہیں وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کی روشنی میں سامراجیت کے ارتداد پر مبنی ہیں۔اقبال نے متحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ بھی اسی لیے پیش کیا تھا تا کہ اس ریاست میں سامراجی عناصر کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکے۔خطبہ''الہ آباد'' میں فرماتے ہیں کہ متحدہ مسلم ریاست کا قیام:

''اسلام کے لیے ایک موقع فراہم کرے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی شہنشاہیت نے اس پر ڈال دیے تھے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لا کر ان کی اصل روح اور عصرِ جدید کی روح سے رابطہ قائم کر سکے۔'' (۲۸)

مطلب یہ کہ اقبال چاہتے تھے کہ ان کی متصورہ اسلامی ریاست میں اسلام کو عربی و عجمی ملوکیت کے اثرات سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل ہو اور ایک مکمل معاشرتی مساوات قائم ہو جائے۔بادشاہت اور سامراجیت کے دور میں جاگیر دار، وڈیرے پھلتے پھولتے ہیں مگر عوام جن کے ٹیکسوں اور کمائی ہوئی دولت کو چھین کر یہ لٹیرے عیش کرتے ہیں، ہمیشہ پریشان حال رہتے ہیں لیکن علامہ کی مجوزہ ریاست ایسی ہوگی جس میں ایسے امکانات مکمل طور پر ختم ہو جائیں گے۔اس مملکت میں ایسے لوگوں کی حکمرانی ہوگی جو دولت کو اپنے ذاتی فائدے کے بجائے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام میں لائیں گے۔ہم عام طور پر نصابی کتب میں علامہ کے تصورِ پاکستان کو صرف خطبہ الہ آباد کی دو چار سطور تک محدود سمجھتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی مجوزہ ریاست کا ایک باقاعدہ نظام متعارف کرایا ہے۔خطبہ الہ آباد کے ایک سال بعد کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے اقبال نے جہاں مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو رد کیا ہے وہیں اپنی مجوزہ ریاست کے معاشرتی نظام کو یوں متعارف کروایا ہے:

''جہاں انسان کا معاشرتی رتبہ اس کی ذات، رنگ یا اس کی آمدنی کی مقدار سے نہیں بلکہ اس طرزِ زندگی سے جو وہ بسر کرتا ہے قائم کیا جاتا ہے۔ جہاں غریب امیروں پر ٹیکس عائد کرتے ہیں۔ جہاں انسانی معاشرہ شکم کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو، جہاں کوئی اچھوت بادشاہ کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے، جہاں نجی ملکیت ایک امانت ہو اور جہاں سرمایا اکٹھا کرنے کی اجازت نہ ہو کہ وہ دولت پیدا کرنے والوں پر چھا جائے۔ تاہم آپ کے مذہب کا یہ اعلا تخیل مولویوں اور شریعت پرستوں کی دقیانوسی خیال آرائیوں سے رہائی کا طالب ہے۔'' (۲۹)

غرض یہ کہ پاکستان اقبال کے تصور میں سامراجیت کے خلاف ایک مضبوط قلعہ تھا۔ انھوں نے سامراج اور سامراجی اندازِ فکر کو ہر مقام پر رد کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بسا اوقات غزل کے اعلا اشعار کہتے کہتے بھی ان کا لاشعور فرنگی سامراجیت کے منھ پر ایک آدھ طمانچا ضرور رسید کر دیتا ہے۔ انھوں نے فرنگی سامراجیت کو جوئے خوں، ناپاک، بے ضمیر اور جانے کیا کیا کچھ کہا۔ اقبال کا تقریباً تمام ہی نثری اور شعری کلام فرنگی سامراجیت کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔ سامراج کے خلاف ان کا احتجاج آخری دم تک جاری رہا۔ ''ارمغانِ حجاز'' کے اردو اور فارسی دونوں حصوں میں ایسی نظمیں اور اشعار نظر آتے ہیں جن سے فرنگی سامراجیت سے اقبال کی شدید نفرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھیے:

اللہ کو پا مردیِ مومن پہ بھروسا		ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت		جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد (۳۰)

چہ گویم رقصِ تو چوں است و چوں نیست		حشیش است ایں نشاطِ اندروں نیست
بہ تقلیدِ فرنگی پائے کوبی		بہ رگہائے تو آں طغیانِ خوں نیست (۳۱)

ترجمہ: میں کیا کہوں تیرا رقص کیسا ہے اور کیسا نہیں ہے؟ یہ بھنگ ہے باطنی سرور نہیں، کیوں کہ تو فرنگی کی پیروی میں ناچ رہا ہے۔ اسی لیے تیری رگوں میں خون کا جوش نہیں ہے، یعنی حرارتِ ایمانی موجود نہیں ہے۔

سجودے آوری دارا و جم را		مکن اے بے خبر رسوا حرم را
مبر پیشِ فرنگی حاجتِ خویش		ز طاقِ دل فرو ریز ایں صنم را (۳۲)

ترجمہ: تو دارا اور جمشید کو سجدہ کرتا ہے۔ اے نادان! حرم یعنی اسلام کو رسوا نہ کر، اپنی حاجت روائی کے لیے فرنگی کے پاس نہ جا، اس بت کو دل کے طاقچے سے نیچے پھینک دے۔

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است		جبینِ خود منہ جز بر درِ اُو
سریں را ہم بہ چوبش دہ کہ آخر		حقے دارد بہ خر پالاں گرِ اُو (۳۳)

ترجمہ: اگر تیری یہ شان وشوکت اور جاہ ومنصب انگریز کا دیا ہوا ہے تو پھر اس کے دروازے کے سوا کہیں اپنی پیشانی نہ رکھ اور اپنی پیٹھ بھی اسی کے ڈنڈے کے حوالے کردے، کیوں کہ گدھے پر آخر اس کے پالان کسنے والے ہی کا حق ہوتا ہے۔

فرنگ آئینِ رزّاقی بہ داند　　با ایں بخشند از او وا می ستاند

بہ شیطاں آں چناں روزی رساند　　کہ یزداں اندر آں حیراں بماند(۳۴)

ترجمہ: انگریز رزّاقی کا دستور جانتا ہے۔ وہ اس کو دیتا ہے تو اس سے واپس لے لیتا ہے۔ وہ شیطان کو اس طرح روزی پہنچاتا ہے کہ خدا اس بارے میں حیران رہ جاتا ہے۔

اقبال ہر فلسفہ خواہ وہ مردِ مومن یا مردِ قلندر ہو، تصورِ شاہین ہو، یا خودی و بے خودی کا نظریہ، فلسفۂ سخت کوشی ہو یا اجتہاد دراصل سامراجی نظام کے خلاف مؤثر کردار کے تشکیلی عنصر کے طور پر سامنے آیا ہے اور اگر ان تمام فلسفوں کا بنظرِ غور مطالعہ کیا جائے تو یہ تمام سلسلے سامراجیت سے نفرت کے سلسلے میں باہم مربوط نظر آتے ہیں۔ اس لیے یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی میں اقبال واحد ایسے بابصیرت فلسفی کے روپ میں ظاہر ہوئے جو سامراجیت اور سامراجی فکر کے سب سے بڑے مخالف تھے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سامراج دشمنی ہی اقبال کی تعلیمات کا اصل خمیر ہے۔

مراجع وحواشی

(۱) سرہندی، وارث (۱۹۸۶ء)، ''قاموسِ مترادفات''، طبع اوّل، لاہور: اردو سائنس بورڈ

(۲) آکسفرڈ، ایڈوانسڈ لرنرز ڈکشنری (Oxford Advanced Learners Dictionary, 5th Ed., Oxford University Press)

(۳) لینن (۲۰۰۵ء)، ''سامراج، سرمایہ دارانہ نظام کی آخری منزل''، عظیم، سید (پیش لفظ)، مترجم، ندارد، لاہور: دارالشعور، ص ۱۸

(۴) دی ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا (The World Book Encyclopedia, Vol 10, London: Scatt Fetzer Company, 1994)

(۵) قریشی، محمد صدیق (۱۹۸۵ء)، ''کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات''، حصہ اول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ص ۳۲۷

(۶) لینن، بحوالہ بالا، ص ۱۴۵۔۱۴۶

(۷) شیر جنگ (۱۹۹۹ء)، ''کارل مارکس اور اس کی تعلیمات''، لاہور: تخلیقات، ص ۳۶۸

(۸) جعفری، رئیس احمد (۱۹۶۹ء)، ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد''، اشاعت سوم، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۴۴

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً، ص ۵۹

(۱۱) ایضاً، ص ۴۵

(۱۲) رومان، پروفیسر، انور (۱۹۹۶ء)، ''اقبال اور مغربی استعمار''، اشاعت ثانی، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۱۸

(۱۳) اقبال، علامہ(۲۰۰۴ء)، ''کلیاتِ اقبال'' (اردو)، اشاعت ششم، لاہور: اقبال اکادمی، ص ۱۶۷

(۱۴) اقبال، علامہ(۱۹۸۱ء)، ''کلیاتِ اقبال'' (فارسی)، اشاعت چہارم، لاہور: اقبال اکادمی، ص ۸۳۷

(۱۵) ایضاً، ص ۸۳۹۔۸۴۷

(۱۶) اقبال، علامہ(۲۰۰۴ء)، بحوالہ بالا، ص ۴۳۴۔۴۳۶

(۱۷) اقبال، علامہ(۱۹۸۱ء) بحوالہ بالا، ص ۹۷۲

(۱۸) ایضاً، ص ۶۵۲

(۱۹) اقبال، علامہ(۲۰۰۴ء)، بحوالہ بالا، ص ۶۶۱۔۶۶۲

(۲۰) اقبال، علامہ(۱۹۸۱ء) بحوالہ بالا، ص ۶۶۶۔۶۶۷

(۲۱) ذوالفقار، ڈاکٹر، غلام حسین (۱۹۹۸ء)، ''اقبال کا ذہنی وفکری ارتقا''، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۱۰۲۔۱۰۳

(۲۲) خورشید، ڈاکٹر، عبدالسلام (۱۹۷۷ء)، ''سرگزشتِ اقبال''، طبع اوّل، لاہور: اقبال اکادمی، ص ۴۳۵

(۲۳) ایضاً، ص ۴۳۶

(۲۴) اقبال، علامہ(۲۰۰۴ء)، بحوالہ بالا، ص ۲۹۱

(۲۵) ایضاً، ص ۴۰۷

(۲۶) اقبال، علامہ، خطبہ ''خلافتِ اسلامیہ'' مشمولہ ''مقالاتِ اقبال''، مرتبہ، عبدالواحد معینی (۱۹۸۸ء)، لاہور: آئینۂ ادب، ص ۱۲۸

(۲۷) ایضاً، ص ۱۲۸۔۱۲۹

(۲۸) ایضاً، خطبہ ''الہ آباد'' مشمولہ ''خطباتِ اقبال''، ص ۶۳، ترجمہ وحواشی، محمد جہاں گیر عالم، فیصل آباد، دائرہ معارف اقبال، ۲۰۰۱ء

(۲۹) ایضاً، '' خطبہ لاہور''، ص ۱۰۶

(۳۰) اقبال، علامہ(۲۰۰۴ء)، بحوالہ بالا، ص ۴۱۷

(۳۱) ایضاً، ص ۲۲۷

(۳۲) اقبال، علامہ(۱۹۸۱ء) بحوالہ بالا، ص ۹۷۸

(۳۳) ایضاً، ص ۱۰۲۱

(۳۴) ایضاً، ص ۱۰۲۳

تعلیقے

i۔ اجارہ داری: سامراجی دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں اجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں۔ اجارہ داریاں بڑے بڑے کاروباروں کے فروغ سے تشکیل پاتی ہیں، کیوں کہ جب بڑے بڑے کاروباروں کو فروغ ملتا ہے تو سرمایہ کم سے کم ہاتھوں میں محدود ہوتا چلا جاتا ہے۔ اجارہ داری ان چند سرمایہ داروں اور سرمایہ دار گروہوں کے آپس کے سمجھوتے کا نام ہے جن کے ہاتھوں میں کسی خاص جنس یا اجناس کی پیداوار ہوتی ہے۔ سرمایہ داروں کے لیے آپس کا یہ سمجھوتا یا معاہدہ بڑا فائدہ مند ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ذریعے وہ آپس کے مقابلے کو ختم کر کے اپنی

اجناس من مانی قیمتوں پر فروخت کر سکتے ہیں۔ایسا سمجھوتا صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب کسی ملک کی مکمل پیداوار کم سے کم ہاتھوں میں منتقل ہو جائے۔سرمایہ داروں کے اس الحاق کی وجہ سے سرمایہ دار ملکوں میں پیداوار کا ایک بڑا حصہ چند بڑے بڑے کارخانہ داروں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور چھوٹے کاروبار تباہ ہو جاتے ہیں۔اسی لیے وہ بڑے بڑے کارخانے جو بہت زیادہ تعداد میں کوئی جنس یا اجناس پیدا کرتے ہیں معیشت پر راج کر رہے ہیں۔یہی بڑے کارخانے دار جب اجناس کی اتنی زیادہ مقدار پیدا کر لیتے ہیں جن کی کھپت اپنے ملک کی منڈیوں میں نہیں ہو پاتی تو یہ اپنی اجناس کی فروخت اور سستے خام مال کے حصول کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش میں نکلتے ہیں اور دنیا کو اپنی جنگِ زرگری کی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

ii۔ سر شیخ عبدالقادر: بیرسٹرایٹ لا علامہ اقبال کے دیرینہ رفیقوں میں سے تھے۔لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔۱۹۰۱ء میں انھوں نے اپنا ادبی رسالہ ''مخزن'' جاری کیا۔یورپ کے قیام کے دوران جب اقبال نے شعرگوئی کا ارادہ ترک کیا تھا تو شیخ عبدالقادر ہی نے اصرار کیا تھا کہ وہ شعر کہنا جاری رکھیں اور اس بارے میں سر آرنلڈ کی رائے کے مطابق فیصلہ کریں۔علامہ کا مشہور شعر:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اسی دور کی یادگار ہے۔اقبال کی پہلی نظم کوہ ہمالہ سے خطاب مخزن میں شائع ہوئی۔اسی رسالے میں علامہ کی ایسی نظمیں بھی شائع ہوئیں جنھیں ''بانگِ درا'' کی اشاعت کے وقت متروک کر دیا گیا یا ان میں ترمیم و اضافہ کیا گیا۔سر عبدالقادر ہی نے بانگِ درا کا دیباچہ بھی تحریر کیا جس میں اقبال کی شاعری کا پہلا بھرپور تعارف موجود ہے۔یہاں جس نظم کا ذکر ہے اس کا پہلا شعر بہت مشہور ہے:

اٹھ کہ پیدا ہوئی ظلمت افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

iii۔ یہ وہی مشہور نظم ہے جس میں اقبال نے دیارِ مغرب میں رہنے والوں کو خبردار کیا ہے کہ خدا کی بستی کو اپنی زرگری کی دکان نہ سمجھیں۔یہ نظم اقبال کی اہم نظموں میں سے ہے جس سے قیامِ یورپ کے دوران ان کے مشاہدے کی گہرائی اور فکری تبدیلی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اس نظم کے ایک شعر میں اقبال نے واضح طور پر اپنے منشور کا علان کرتے ہوئے کہا ہے:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا